فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

(۵)

آخرت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا | آخری اہم بات جو قرآن مجید نے آخرت کے سلسلے میں بتائی وہ یہ تھی کہ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، کجا کہ کسی کو اپنے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، دوست یا مُرید اور پیر کو بچانے کی فکر ہو۔ ہر شخص اپنے اعمال کا بوجھ خود اُٹھائے گا، کوئی نہ کسی دوسرے کا بوجھ رتّی برابر بھی اُٹھانے کے لیے تیار ہوگا، اور نہ خدا کا انصاف یہ گوارا کرے گا کہ ایک کا بارِ گناہ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ فیصلہ اُس وقت بالکل اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہوگا جو مالک یوم الدین ہے۔ اُس دربار میں بولنے کا یارا کسی کو نہ ہوگا اِلّا یہ کہ اللہ خود اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ط وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔ (الفاطر: ۱۸)	کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اُٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی ہٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

"بوجھ" سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اُسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات

یہاں اس بنا پر فرمائی جا رہی ہے کہ مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے، اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اِس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

پہلے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اُس کے اپنے ہی گناہ کا ذمّہ دار ٹھیرائے گا۔ اور بعد کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بارِ گناہ اپنے اُوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسہ دلا رہے ہیں جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا۔ اور کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اُوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ	اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے
وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ	باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اُن میں
وَبَنِيهِ ۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	سے ہر شخص پر اس دن ایسا وقت آپڑے گا کہ اسے اپنے
يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۔	سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔

(عبس - ۳۴ تا ۳۷)

بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اُن عزیزوں کو جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے مصیبت میں مبتلا دیکھ کر، بجائے اس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا اُن سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اسے مدد کے لیے نہ پکار بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر یہ سب جس طرح ایک دوسرے کی خاطر گناہ کرتے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہگاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمہ کے گواہ بننے والے ہیں۔

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۝	اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا
يُبَصَّرُونَهُمْ ۔ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ	حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا

لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ ۢ بِبَنِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ (المعارج - ۱۱ تا ۱۴)

کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور رُوئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔

یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے۔ بلکہ ہر ایک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا، کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی، اس کے برعکس وہ چاہے گا کہ ان سب کو فدیہ میں دے کر خود چھوٹ جائے۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۙ (المومن - ۱۸)

ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

ظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق پر ظلم کر کے ناحق اور ناراستی کا طریقہ اختیار کیا ہو۔ حمیم سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو پٹتے دیکھ کر جوش میں آئے اور اُسے بچانے کے لیے دوڑے۔ آخری بات برسبیل تنزّل، کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کرنے کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فُسّاق وفُجّار کے دوست نہیں ہوسکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں۔ لیکن چونکہ کفار ومشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اَڑ کر کھڑے ہوجائیں گے اور ہم کو بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے، اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۔ (النبا - ۳۸)

وہ دن جبکہ روح (جبریل) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جس کو رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

یعنی میدانِ حشر میں دربارِ الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ اہلِ زمین ہوں یا اہلِ آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی

کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھولے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔ بولنے سے مراد شفاعت ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُسی شخص کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا بجائے خود درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اس میں مزید ایک شرط یہ بھی نکلتی ہے کہ جس کے معاملہ میں وہ سفارش کرے وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو۔ یعنی محض گنہگار ہو، کافر نہ ہو۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ	یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی
شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ	کے بس میں نہ ہوگا اور فیصلہ اُس دن بالکل اللہ
لِّلَّهِ۔ (الانفطار۔ ۱۹)	کے اختیار میں ہوگا۔

یہ تھا دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ جس کو اِس زور کے ساتھ، اِس معقول انداز میں، اِتنی وضاحت سے پیش کیا گیا کہ اُس کے سامنے کفار کے محض ٹھٹھے، اور یہ احمقانہ مطالبے کہ اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو، کسی طرح ٹھیر نہ سکتے تھے۔ جو لوگ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے، اور جن کو بہر حال لڑنا ہی تھا، اُن کو چھوڑ کر ہر ذی ہوش آدمی یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخرت کا برپا ہونا نہ امکان سے خارج ہے، نہ عقل کے خلاف ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر دنیا میں انسان کا طرزِ عمل حق اور انصاف کے مستقل اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکے، اور نہ انسان کو حقیقی اور مکمل انصاف اِس کے سوا کسی اور طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظامِ عالم ختم ہونے کے بعد قیامت اور حشر برپا ہو، تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے مالک کائنات کے سامنے پیش کیا جائے، اور بالکل بے لاگ طریقے سے ہر شخص کی ذمہ داری متشخص کر کے جزا یا سزا، جس کا بھی وہ مستحق ہو اُسے دی جائے۔

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

دعوتِ اسلامی نے یہ عقائد اِتنے مدلّل اور موثّر طریقہ سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک نہایت واضح

تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہوگیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کونسا نمونہ اس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور مٹانا چاہتا ہے اور کونسا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ بُرائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے، کیا اُس کے پیدا ہونے کے اسباب ہیں، کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہے، اور کیا چیزیں اسے نشوونما دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اس کی نظر میں کیا ہے، کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے، کس طرح اس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں، اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ اسلام کا مقصد ہی بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرے تک ہر شعبۂ حیات میں بُرائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کرنا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اتنا مفصل، اتنا صریح، اتنا دل نشین اور عقلِ عام کے لیے اس قدر قابلِ فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے ان کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

اخلاق کے مسئلے میں چند بنیادی حقائق اس سلسلے میں سب سے پہلے چند حقائق لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ اخلاق کا مسئلہ بنیادی طور پر اُن کی سمجھ میں آجائے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (الشمس ۷ تا ۱۰)	اور قسم ہے نفسِ انسانی کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے ہموار کیا، پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر اِلہام کردی، یقیناً فلاح پاگیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوگیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔

نفسِ انسانی کو ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ خالق نے اُس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اس کو دیکھنے، سُننے، چھونے، چکھنے اور سُونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اُس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اُس کو قوتِ عقل و فکر، قوتِ استدلال و استنباط، قوتِ خیال، قوتِ حافظہ، قوتِ تمیز، قوتِ فیصلہ،

قوتِ ارادی، اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اُسے جبلّی بدمعاش اور پیدائشی گناہ گار بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خِلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔

الہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصور یا خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اس کی بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی، دونوں کے رُجحانات و میلانات رکھ دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصورات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز بُرائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکاری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (بُرائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصورات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت ان سے آشنا ہے اور خالق نے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔

تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا، اُبھارنا اور نشوونما دینا۔ اور تدسیہ کا مطلب ہے دبانا، چھپانا، بہکانا اور گمراہ کر دینا۔ آیت میں یہ بات فیصلہ کن طریقے سے کہی گئی ہے کہ انسان کی فلاح اور نامرادی کا سارا انحصار اس سوال پر ہے کہ اللہ نے جو قوتیں اُس کو دی ہیں اُنہیں استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں سے کن کو اُبھارتا اور کن کو دباتا ہے۔ فلاح صرف اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے، اُس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندیوں پر لے جائے اور اس کے اندر بھلائیوں کو نشوونما دے۔ اِس کے برعکس نامراد ہے وہ جو اپنے نفس کے اندر پائے جانے والے نیکی کے رُجحانات کو اُبھارنے اور نشوونما دینے کے بجائے اُن کو دبا دے، اُس کو بہکا کر بُرائی کے رُجحانات کی طرف لے جائے، اور فجور کو اُس پر اتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اُس کے نیچے اس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھپ جاتی ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو (ماں اور باپ کے) ایک مخلوط
أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ	نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں، اور
سَمِيعًا بَصِيرًا - إِنَّا هَدَيْنَاهُ	اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا
السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَ	بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا

إِمَّا كَفُورًا (الدھر۔ ۲-۳) بنے یا کُفر کرنے والا۔

ماں اور باپ کے مخلوط نطفے سے تو انسان کی طرح جانور بھی پیدا ہوتا ہے، مگر انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ جانور اِس دنیا میں امتحان کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِسی وجہ سے جانوروں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اُس کو سمیع و بصیر بنایا، یعنی علم و عقل کی طاقتیں بخشیں، تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ پھر محض یہی طاقتیں دے کر اُسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اُس کی رہنمائی بھی کی تاکہ وہ یہ جان لے کہ بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے شکر کا راستہ کونسا ہے اور کُفر (ناشکری) کا راستہ کونسا۔ اب اُس کا امتحان اس امر میں ہے کہ دونوں راہوں کے فرق سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی ان طاقتوں سے کام لے کر شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کُفر کی راہ۔

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد۔ ۸ تا ۱۰) کیا ہم نے اسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں دکھا دیے؟

یعنی کیا ہم نے اس کو علم اور عقل کے ذرائع نہیں دیے؟ دو آنکھوں سے مُراد گائے بھینس کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آئیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مراد بھی محض بولنے کے آلات نہیں ہیں، بلکہ نفسِ ناطقہ ہے جو ان آلات کی پشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا اور اِن سے اظہارِ مافی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے یونہی چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے اس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے بھی نمایاں کر کے رکھ دیے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمہ داری پر اختیار کرے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ (التین۔ ۴ تا ۶) ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُلٹا پھیر کر ہم نے اسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ اعلےٰ درجے کا جسم عطا کیا ہے جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا، اور اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے پھر بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے گراوٹ کی اِس انتہا کو پہنچا دیتا ہے کہ کوئی ارذل ترین مخلوق بھی اُس تک نہیں پہنچی۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیض و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں سے جس خصلت میں بھی آدمی مُستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو دیکھیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں سب درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہوا انسان اپنی عقل اور قوتِ ایجاد سے کام لے کر ایک سے ایک مہلک ہتھیار بناتا چلا جاتا ہے تاکہ پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے اختراع کرتا ہے جن کا تصور بھی کسی درندے کے دماغ میں کبھی نہیں آسکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچتا ہے کہ دشمن کی عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں اور بھائیوں اور شوہروں کے سامنے ان کی بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کی عصمت لوٹتے ہیں۔ بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں۔ ماؤں کو اپنے بچوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسانوں کی اس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ ان میں سے جس طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو ارذل المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتّٰی کہ مذہب جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پوجتے پوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پوج ڈالتا ہے اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے جن سے زنا کا ارتکاب

کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ معبود کا درجہ دیتا ہے اُن کی طرف اس کی دیومالا میں ایسے ایسے گندے قصّے منسوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسانوں کے لیے بھی باعث شرم ہیں۔

اِن حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کیں۔ ایک نفسِ اَمّارہ، جو آدمی کو بُرائیوں پر اُکساتا ہے (یوسف-۵۳)۔ دوسرا نفسِ لوّامہ، جو انسان کو بُرائی کے خیال، خواہش، اِرادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے اور اس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا رہتا ہے۔ (القیامہ-۲)۔ تیسرا نفسِ مطمئنّہ، جو پورے اطمینان قلب کے ساتھ بُرائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے، اور اُسے اِس بات پر کوئی حسرت لاحق نہیں ہوتی کہ اُس نے بُرائی کی لذتوں اور فائدوں کو کیوں چھوڑا اور بھلائی کی خاطر کیوں محرومیاں، قربانیاں، تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ اِس پر حسرت تو درکنار، اُس کا دل اِس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ بُرائی کی گندگی سے بچ گیا، اور بھلائی کی پاکیزگی اُسے حاصل ہوگئی۔ اِسی تیسری قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا اور اسے جنّت کی خوشخبری سُنائی ہے (الفجر-۲۷ تا ۳۰)

اسبابِ ضلالت اس کے بعد قرآن مجید میں ایک ایک کر کے اُن اسباب کو بیان کیا گیا جن کی بدولت انسان بالعموم گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے ہیں، اور جو قرآن کے اوّلین مخاطَب، کفّارِ قریش اور عام کفّارِ عرب کی بھی گمراہی کے اسباب تھے۔

۱- باپ دادا کی اندھی تقلید ان میں سے اوّلین چیز دینِ آبائی کی اندھی تقلید ہے جو صرف اس بنا پر کی جاتی رہی ہے کہ باپ دادا سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے، اور کبھی خود اپنی عقل سے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ باپ دادا جو کچھ کرتے تھے وہ درست اور معقول بھی تھا یا نہیں۔ اس اندھی تقلید کے لیے کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے تاریخ سے مثالیں پیش کیں کہ جب حضرت ہُودؑ نے عاد کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکا اور انہیں راہ راست پر آنے کی تلقین کی تو اُنھوں نے صرف یہ کہہ کر اُن کی تمام دلیلوں اور نصیحتوں کو رد کر دیا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟" (الاعراف-۷۰) حضرت صالحؑ نے جب ثمود کو سمجھانے کی کوشش کی تو ان کا جواب یہ تھا کہ "اے صالح اس سے پہلے تو ہمارے درمیان تُو ایسا شخص تھا جس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ جس طریقے کی طرف تو ہمیں بُلا رہا ہے اس کے بارے میں ہمیں سخت

شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال دیا ہے" (ہود - ۶۲)۔ حضرت شعیبؑ نے جب اہلِ مدین کو ان کی صریح گمراہیوں پر متنبہ کیا تو ان کا جواب بھی یہی تھا کہ "اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (ہود - ۸۷)۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ "یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟" تو ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے"۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر ان سے صاف کہہ دیا کہ "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (الانبیاء - ۵۲ تا ۵۴) حضرت ابراہیمؑ نے ان سے پوچھا کہ یہ تمہاری دعاؤں کو سنتے بھی ہیں؟ اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟ مگر اُن کا جواب یہ تھا کہ ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ ہم تو یہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے" (الشعراء - ۷۰ تا ۷۴)۔ حضرت موسیٰؑ نے جب کھلے کھلے معجزات کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو دعوتِ حق دی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟" (یونس - ۷۸)۔ اِن مثالوں کو پیش کرتے ہوئے قرآن مجید نے بتایا کہ تمام جاہل قوموں نے اپنے انبیاء کی دعوت کو اسی حجتِ بے حجت سے رد کیا ہے۔ چنانچہ پہلی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب ہی نے اپنے انبیاء کی صاف صاف دلیلوں، نصیحتوں اور فہمائشوں کا اگر کوئی جواب دیا تو یہ کہ "تم کچھ نہیں ہو مگر ہمارے ہی جیسے انسان، چاہتے ہو کہ ہم کو اُن معبودوں کی بندگی سے روک دو جنکی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں" (ابراہیم - ۱۰)۔ دوسری جگہ فرمایا "اسی طرح اے نبی، تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی خبردار کرنے والا بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلتے رہو گے خواہ میں اُس راستے سے زیادہ سیدھا راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس چیز کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں" (الزخرف ۲۳ - ۲۴)۔ اور یہ کچھ پچھلی قوموں ہی کا حال نہیں تھا بلکہ ہر زمانے کے جاہل لوگوں کا طریقہ یہی ہے اور رہا ہے کہ "وہ کسی علم اور ہدایت اور روشنی دکھانے والی کتاب کے بغیر اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اُس طریقے

کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان اُن کے باپ دادا کو جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو" (لقمان - ۲۰-۲۱)۔

یہ مثالیں پیش کر کے قرآن نے براہ راست قریش اور اہلِ عرب کو متنبہ کیا کہ تم بھی انہی لوگوں کی طرح ہو۔ نہ خود اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچتے ہو کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو یہ صحیح بھی ہے یا نہیں، اور نہ دلیل و حجت کے ساتھ تمہارے مذہب، رسوم اور اطوار کی جو غلطی تمہیں سمجھائی جاتی ہے اُس پر کچھ غور کرتے ہو۔ بس صرف اِس وجہ سے ایک غلط چیز پر اصرار کر رہے ہو کہ یہ باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ سورۂ صافّات میں فرمایا: "ان لوگوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا، لہٰذا یہ انہی کے پیچھے دوڑ چلے، حالانکہ اِن سے پہلے اکثر گزرے ہوئے لوگ گمراہ ہو چکے تھے" (آیات ۶۹ تا ۷۱)۔ سورۂ ہود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا "تم اُن معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ بس اُسی طرح عبادت کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے اِن کے باپ دادا کرتے تھے" (آیت ۱۰۹)۔ برہنگی و عریانی جیسی کھُلی شرمناک بات پر جب قریش اور اہلِ عرب کو ٹوکا گیا اور انہیں اس بات پر شرم دلائی گئی کہ کعبہ کے گرد بھی وہ برہنہ طواف کرنے میں تامل نہیں کرتے جس سے زیادہ صریح گھناؤنا فعل کوئی نہیں ہو سکتا تو انہوں نے اسے بھی تقلید آبائی کی بنیاد پر جائز ٹھیرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے "جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ان سے کہو، اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کو تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کا حکم دیا ہے"؟ (آیت ۲۸)۔ کفارِ عرب طرح طرح کی غیر معقول جاہلانہ رسموں پر جمے ہوئے تھے اور بلا کسی دلیل کے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ سب اللہ کی مقرر کردہ ہیں۔ اِس کے متعلق سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بس وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے خواہ وہ کوئی علم نہ رکھتے ہوں اور راہ راست پر نہ ہوں"؟ (آیت ۱۰۴)۔ اسی طرح کفارِ عرب نے حلال و حرام کی بہت سی خود ساختہ پابندیاں صرف اس دلیل سے اپنے اُوپر لازم کر لی تھیں کہ یہ پہلے سے چلی آ رہی ہیں، اور ان میں بہت سی حلال چیزیں حرام، اور بہت سی حرام و شرمناک اور قبیح چیزیں حلال کر لی گئی تھیں۔ ان کے متعلق سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا کہ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اُس ہدایت کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ ہم تو اُس طریقے کی پیروی کریں گے

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اور کیا یہ انہی کی پیروی کیے جائیں گے خواہ اِن کے باپ دادا نہ کسی چیز کی سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں؟" (آیت - ۱۷۰)

سورۂ انعام میں اس اندھی تقلید کو ایسے پُر زور طریقے سے نامعقول ثابت کیا گیا کہ عرب کے ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم لوگ بھی ایک دفعہ تو اپنے دلوں میں مان گئے ہوں گے کہ فی الواقع ہم نہایت ہی لغو باتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ فرمایا:

"اِن لوگوں نے اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور جانوروں میں سے ایک حصہ مقرر کر رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے لیے ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو اِن کے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ اِن کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[1]۔ کیسے بُرے فیصلے ہیں جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے اُن کے شرکا نے خود اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تا کہ اُن کو ہلاکت میں ڈالیں اور اُن پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں[2]......... اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور کھیتیاں محفوظ ہیں، اِن کو کوئی

---

[1] یعنی جو غلے یا پھل وغیرہ اللہ کے نام پر نکالے جاتے تھے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصے میں سے گرتا یا خدا کے حصے میں مل جاتا تو اسے اُنہی کے حصے میں واپس کیا جاتا تھا۔ کھیت کا جو حصہ شریکوں کی نذر نیاز کے لیے مخصوص ہوتا تھا اگر اس میں سے پانی اُس حصے کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصہ میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آجاتی تو خدا کے حصے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا حصہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصے سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصہ میں سے ایک حبہ بھی خدا کے حصے میں نہ ڈالا جاتا۔

[2] یعنی اُنہیں اس غلط فہمی میں ڈال دیں کہ یہ بھی اُسی دین کا کوئی حصہ ہے جو انہیں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ملا تھا۔ اس مقام پر ظاہر ہے کہ شریکوں سے مراد دیوتا اور معبود نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے لعد کے دور میں غلط عقائد اور مذہبی رسوم کو رواج دیا اور لوگوں نے ان کی اس طرح پیروی کی جیسی خدا کے قانون کی کرنی چاہیے۔

نہیں کھا سکتا سوائے اُس کے جسے ہم کھلانا چاہیں، بزعم خود - اور کچھ جانور ہیں جن کی سواری و بار برداری حرام کر دی گئی ہے، اور کچھ جانور ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر افترا کرتے ہوئے (یعنی یہ جھوٹ گھڑتے ہوئے کہ اللہ نے ان پر اپنا نام لینے سے منع کر دیا ہے)....... اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام - لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو مرد اور عورت سب اس میں شریک ہیں......... یہ آٹھ نر و مادہ ہیں - دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے - اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ان سے پوچھو کہ اللہ نے ان کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ذرا ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو - اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے - ان سے پوچھو ان کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا تمہیں حکم دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط رہنمائی کرے - یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا" (آیات ۱۳۶ تا ۱۴۴) -

۲ - بڑے لوگوں اور پیشواؤں کی غلط پیروی | تقلیداً بائی سے قریب تر ایک اور سبب گمراہی کی قرآن نے نشاندہی کی جو لوگوں کو بگاڑنے اور معاشرے کو خراب کرنے میں اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور وہ ہے اپنی قوم، یا دنیا کے بڑے لوگوں، لیڈروں، مذہبی پیشواؤں، اور دولت مند سرداروں کی پیروی جو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھر سے جا رہے ہیں، صرف اس بنا پر کی جائے کہ وہ ہیں بڑے لوگ - قرآن نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ قیامت کے روز اس طرح کی پیروی کرنے والے پچھتا پچھتا کر کہیں گے:

"اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ سے بے راہ کر دیا - اے ہمارے رب، ان کو دُہرا عذاب دے اور اُن پر سخت لعنت کر" (الاحزاب - ۶۷ - ۶۸) -

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اُن جنوں اور انسانوں کو دکھا جنہوں نے ہم کو

گمراہ کیا تھا، ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ ضرور ذلیل و خوار ہوں" (حٰم السجدہ - ۲۹)۔

"(جب اللہ تعالیٰ سزا دے گا) اُس وقت وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے لاتعلقی ظاہر کریں گے، مگر عذاب دیکھ کر رہیں گے اور اُن کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں ان کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع پھر مل جاتا تو ہم اِن سے اُسی طرح بیزار ہو کر دکھا دیتے جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ یوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دنیا میں کر رہے ہیں اِن کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں سے ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے" (البقرہ - ۱۶۶-۱۶۷)۔

"کاش تم اِن ظالموں کا حال اُس وقت دیکھو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے سے دُو بدُو جھگڑا کریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے" تم نہ ہوتے تو ہم مسلمان ہوتے"۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں سے کہیں گے کہ" کیا ہم نے تم کو ہدایت قبول کرنے سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ تم تو خود ہی مجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے" نہیں، بلکہ وہ شب و روز کی مکّاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے" (سبا - ۳۱ تا ۳۳)

اِس حقیقت کو قرآن نے بطور ایک عالمگیر قانون کے بیان کیا کہ کسی معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال اور اُونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اُس کے دولت مند اور صاحب اثر و اقتدار لوگ فسق و فجور پر اُتر آتے ہیں ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور آخر یہی فتنہ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا۔ (آیت - ۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں فسق کرنے لگتے ہیں، تب عذاب کا فیصلہ اُس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کرکے رکھ دیتے ہیں۔

۳۔غرور و تکبر | تیسرا اہم سبب ضلالت جس کی قرآن نے نشان دہی کی وہ یہ ہے کہ انسان حق بات ماننے سے صرف اس لیے انکار کرتا ہے کہ اُسے اپنے رویہ کی غلطی تسلیم کرنے میں اپنی ہیٹی ہوتی نظر آتی ہے، یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اِس حق کو تسلیم کر لوں گا تو گمراہ معاشرے میں جو اُونچا مقام مجھے حاصل ہے وہ مجھ سے چھن جائے گا، یا وہ خیال کرتا ہے کہ اپنی بات چھوڑ کر دوسرے کی بات مان لینا اُس کے مقامِ بلند سے فروتر ہے قطعِ نظر اس سے کہ وہ بات کتنی ہی غلط ہو جس پر وہ اڑا ہوا ہے اور وہ بات کتنی ہی برحق ہو جسے دوسرا شخص پیش کر رہا ہے۔قرآنِ مجید میں اس سببِ ضلالت کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ اُن کا اپنا غرور بھی ٹوٹے جو قبولِ حق میں مانع ہو رہا تھا، اور اُن کے بہت سے علمبردارانِ ضلالت کی گمراہی کے اصل سبب سے بھی وہ واقف ہو جائیں جو اُن کے اپنے زمانے میں، یا اُن سے پہلے گذرے ہوئے زمانے میں حق کا راستہ روکنے والے تھے۔

مثال کے طور پر سورۂ نوح میں حضرت نوحؑ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز (راہِ حق کی طرف آنے کے لیے) پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔اور جب بھی میں نے ان کو دعوت دی تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبر کیا"[1] (آیات ۶-۷)

سورۂ المومن میں یہ قصہ بیان کیا گیا کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اُسی کے اہلِ دربار میں سے ایک حق پسند آدمی نے بڑے دردمندانہ اور خیر خواہانہ انداز میں نہایت مدلّل طریقے

---

[1] تکبر سے مراد یہ ہے کہ اُنہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کرنے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو رد کرنا ہوگا۔

سے اُس کو سمجھانے اور غلط رَویہ چھوڑ کر راست روی اختیار کرنے کی تلقین کی۔ مگر اُس نے اِن باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ

اِس طرح اللہ ٹھپّہ لگا دیتا ہے ہر متکبر و جبار کے دل پر۔

(آیت ۳۵)

یعنی تکبر اور جبّاریت کی ہوا جس دل میں بھر جاتی ہے پھر اُس کے دروازے ہر کلمہ نصیحت اور ہر قولِ حق کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور اللہ پھر اُس پر لعنت کی ایسی مہر لگا دیتا ہے کہ خواہ کوئی اسے راہ راست پر لانے کی کتنی ہی کوشش کرے، وہ کسی طرح سیدھا نہیں ہوتا۔

سورۂ اعراف میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جب تختیوں پر ایک ہدایت نامہ لکھ کر دیا تو اس کے ساتھ ہی متنبہ فرما دیا کہ "میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو کسی حق کے بغیر زمین میں تکبر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اُسے اختیار کر لیں گے" (آیت ۱۴۶)۔

سورۂ بقرہ میں فرمایا "انسانوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تم کو بہت بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ یہ باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ فساد برپا کرنے اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرنے میں صرف ہوتی ہے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا گھمنڈ اس کو گناہ پر جما دیتا ہے" (آیات ۲۰۴ تا ۲۰۶)۔

سورۂ مُدّثّر میں خود مکہ کے ایک سردار کا کردار پیش کیا گیا جس نے قریش کے سرداروں کے سامنے صاف صاف اعتراف کیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات وہ لگا رہے ہیں وہ جھوٹے ہیں، اور قرآن ایک ایسا کلام ہے جس میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری ہے اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں، مگر جب اُس کے سامنے یہ سوال آیا کہ اِس رسول اور اِس کلام کو حق مان کر میں اپنی سرداری کھو بیٹھوں۔ یا اس پر جھوٹا الزام لگا کر اپنی سرداری بچالوں، تو اُس نے دوسری چیز کو ترجیح دی اور اپنے ضمیر سے لڑ کر آخر کار ایک الزام تصنیف کر ڈالا جسے اس کا دل خود جانتا تھا کہ وہ محض اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لیے ایک صریح

جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ قرآن نے اُس کی یہ تصویر پیش کر کے اُسے بالکل بے نقاب کر دیا:

"اُس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا۔ پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا۔ پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۵)۔

۴۔ دنیا کی خوشحالی و بدحالی کو خیر و شر کا معیار سمجھنا

پھر قرآن نے بتایا کہ گمراہی کا ایک اور بڑا سبب یہ خیال ہے کہ دنیا میں جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہی معیار خیر و شر ہیں۔ یہاں اگر کوئی خوشحال ہے، خواہ اُس کی خوشحالی کیسی ہی بدکرداریوں کا نتیجہ ہو، وہ کامیاب ہے، اور یہاں جو خستہ حال ہے، خواہ اُس کی خستہ حالی کیسی ہی نیک عملی کے ساتھ ہو، وہ بہرحال ناکام ہے۔ گویا خیر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر اچھا نظر آرہا ہے، اور شر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر بُرا دیکھا جارہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس ظاہری "خیر" کے پیچھے کتنی ہی حرام خوریاں اور بداخلاقیاں پائی جاتی ہوں، اور وہ "شر" اپنے پیچھے کتنا ہی حسنِ عمل اور بلندیِ اخلاق کا سرمایہ رکھتا ہو۔ قرآن نے اس غلط نقطۂ نظر کی مثالیں پچھلی تاریخ سے بھی پیش کیں، اور خود مکہ اور عرب کے لوگوں کی گفتار و کردار میں بھی اس کو نمایاں کر کے دکھایا۔

حضرت نوحؑ کے قصہ میں بتایا کہ اُن کی قوم کے سرداروں نے یہ کہہ کر اُن کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ اُن پر ایمان لانے والے غریب لوگ تھے جنہیں معاشرہ میں کوئی بلند مرتبہ حاصل نہ تھا۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ "اُنہوں نے کہا کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی ادنیٰ ترین لوگوں نے کی ہے" (الشعراء آیت ۱۱۱)۔

حضرت صالحؑ کے قصے میں قرآن نے صراحت کی کہ اُن کے غریب پیروؤں سے ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" انہوں نے کہا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ "ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں"۔ اس پر اُن بڑے لوگوں نے کہا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "ہم اُس چیز کو ماننے والے نہیں جس پر تم ایمان لائے ہو" (الاعراف ۷۵-۷۶)۔ یعنی تم جیسے حقیر لوگوں نے جس چیز کو مانا ہے اسے ہم نہیں مان سکتے۔

پھر تمام انبیاء کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ اُن سب کے مخالف اُن کی قوم کے خوشحال لوگ تھے اور ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس کو دنیا میں خوب مال و اولاد نصیب ہے وہی حق پر ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ (سبا ۔ ۳۴-۳۵)

اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو ماننے والے نہیں - اور انہوں نے کہا ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔

یہی سوچنے کا انداز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفارِ مکہ اور اہلِ عرب کا تھا جس کے غلط ہونے پر قرآن مجید میں بار بار اُن کو ٹوکا گیا۔ سورۂ مریم میں فرمایا" ان لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں شاندار ہیں ؟ حالانکہ ان سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں" (آیات ۷۳، ۷۴)۔ سورۂ مومنون میں فرمایا" کیا یہ لوگ اس خیال میں ہیں کہ ہم جو اِن کو مال اور اولاد سے نوازے جا رہے ہیں تو انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے - درحقیقت جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں، اور جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اور جن کا حال یہ ہے کہ (اپنے رب کی خوشنودی کے لیے) جو نیک کام وہ بجا لاتے ہیں اُن کے بعد بھی اُن کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ اُنہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، وہی دراصل بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے اُنہیں پالینے والے ہیں" (آیات ۵۵ تا ۶۱)۔ اسی بات کو سمجھانے کے لیے سورۂ فجر میں پہلے عاد اور ثمود اور فرعون جیسی زبردست ترقی یافتہ قوموں اور سلطنتوں کی طغیانی و سرکشی کا انجام بیان کیا اور پھر فرمایا کہ انسان اب بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ دنیا کی نعمت و دولت ہی اصل عزت ہے اور یہاں کی غربت و تنگ دستی ہی اصل ذلت ہے، حالانکہ نعمت و دولت ہو یا غربت و تنگ دستی، دونوں ہی انسان کی آزمائش کے لیے ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی اصل عزت و ذلت کا معیار نہیں ہے (ملاحظہ ہو الفجر، آیات ۱۵-۱۶)۔

۵۔ خواہشِ نفس اور قیاس و گمان کی پیروی | گمراہی کے اسباب بتاتے ہوئے قرآن نے ایک اور اہم سبب کی بھی نشاندہی کی اور وہ یہ کہ انسان محض قیاس و گمان کی بنا پر کسی چیز کو حق اور کسی دوسری چیز کو باطل سمجھ بیٹھے، یا اپنی خواہشات نفس کو اپنا خدا بنا کر اُن کی ایسی بندگی کرے کہ جدھر جدھر وہ چاہیں اُسے گھسیٹے لیے پھریں، مگر کبھی خدا کی دی ہوئی عقل اور اس کے بخشے ہوئے ذرائعِ علم سے کام لے کر وہ یہ نہ دیکھے کہ اپنے گمانوں اور قیاسات کی بنا پر اُس نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یا اپنی خواہشات کی پیروی میں وہ جس راہ پر چلا جا رہا ہے وہ صحیح اور معقول بھی ہے یا نہیں۔ اِس غلطی پر قرآن نے بار بار لوگوں کو متنبہ کیا تاکہ وہ خیالات اور خواہشات کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے عقل و خرد کی سیدھی راہ پر آئیں۔

سورۂ اعراف میں ایک شخص کی مثال پیش کی گئی جو علم رکھنے کے باوجود خواہشاتِ نفس کی پیروی میں دنیا کا کُتّا بن کر رہ گیا تھا، پھر اُس جیسے لوگوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اُن کے پاس دل ہیں، مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔" (آیات ۱۷۶ تا ۱۷۹)۔

سورۂ انفال میں اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا جو سب کچھ سُننے کے بعد بھی گویا کچھ نہ سُنتے تھے، اور پھر فرمایا: "درحقیقت اللہ کے نزدیک تمام جاندار مخلوقات میں سے بدترین مخلوق وہ بہرے اور گونگے ہیں جو ذرا عقل سے کام نہیں لیتے" (آیت ۲۲)۔ بہرے اور گونگے سے مراد جسمانی بہرے اور گونگے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہ حق سُنتے ہیں اور نہ حق بولتے ہیں۔

سورۂ یونس میں آیت ۳۱ سے ۳۵ تک پے در پے یہ دلائل دینے کے بعد کہ جن جن معبودوں کو مشرکین نے خدائی میں ربِّ کائنات کا شریک بنا رکھا ہے ان میں سے کوئی بھی خدائی صفات اور اختیارات نہیں رکھتا، صاف فرمایا گیا کہ اُن کو معبود کسی علم کی بنا پر نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض گمان و قیاس سے اپنی جگہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ بھی خدائی میں کچھ حصہ رکھتے ہیں "ان میں سے اکثر لوگ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا" (آیت ۳۶)۔

سورۂ حج میں پچھلی گذری ہوئی غلط کار قوموں کی تباہی کے آثار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ (اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر دیکھ کر) ان کے دل سمجھنے والے

یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں" (آیت ۴۶)

اسی طرح سورۂ فرقان میں قومِ نوح، عاد، ثمود، اصحاب الرّس، قومِ فرعون اور قومِ لوط کے انجام کی طرف توجہ دلانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمّہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے" (آیات ۴۳-۴۴)

یہی بات سورۂ جاثیہ میں بھی فرمائی کہ "اے نبی، کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہی میں پھینک دیا، اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے بعد اور کون ہے جو اسے ہدایت دے" (آیت ۲۳)

۶- برائی کو خوبی سمجھنا اور غیرِ حق پر مگن رہنا | ایک اور چیز کو جس کو قرآن نے افراد اور معاشرے کی گمراہی کے بڑے اسباب میں شمار کیا وہ یہ تھی کہ انسان بُرے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے، حق کے خلاف چلتے ہوئے سرے سے کوئی بے اطمینانی محسوس ہی نہ کرے، بلکہ اُلٹا اُس پر مگن ہو، اُس پر اترائے، اور حق جاننے کی ضرورت سے بالکل بے نیاز ہو۔ چنانچہ سورۂ فاطر میں فرمایا "بھلا کچھ ٹھکانا بھی ہے اُس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو" (آیت ۸)۔ اور سورۂ مومن میں فرمایا کہ "جہنم میں جب لوگوں کو عذاب دیا جا رہا ہو گا اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا کہ تم زمین میں غیرِ حق پر مگن تھے اور اُس پر اِتراتے تھے" (آیت ۷۵)۔

۷- یہ خیال کہ نیکی اور حق پرستی سے انسان کی دنیا برباد ہو جاتی ہے | قرآن مجید میں اِس خیال کو بھی ایک بڑا سببِ گمراہی بتایا گیا۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے اور قافلے لوٹنے اور رہزنی کرنے سے روکا تو قوم کے سرداروں نے لوگوں سے کہا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ "اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً تباہ ہو جاؤ گے" (آیت ۹۰)۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ بھلا کہیں تجارت میں ایمانداری برتنے سے بھی کاروبار چل سکتا ہے؟ اور ہم جو تجارتی قافلوں کے راستے پر آباد ہیں، اگر رہزنی نہ کریں، اور راستوں کو پُرخطر بنا کر قافلوں سے بھاری

رہگذر وصول نہ کریں تو ہماری یہ خوشحالی کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ یہی بات قریش کے سرداروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۔ " اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے" (القصص - ۵۷)- یعنی ہمارا جو کچھ اثر عرب کے لوگوں پر ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں مشرکینِ عرب کے مذہبی پیشوا بنے ہوئے ہیں - اسی وجہ سے ہماری تجارت چمک رہی ہے - اسی وجہ سے ہمارے قافلوں کو سارے ملک کے راستوں میں امن میسر ہے - اور اسی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ہمارا احترام کرتے ہیں - اگر ہم آپ کی بات مان کر وہ راہ اختیار کرلیں جو آپ پیش کر رہے ہیں تو سارا عرب ہمارا مخالف ہو جائے گا، جو حیثیت ہمیں ملک میں حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی، اور ہمارا مکّے میں بھی امن چین سے رہنا ممکن نہ رہے گا۔

۸۔ شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ یہ قدیم ترین زمانے سے ہر دور میں گمراہی کا ایک بڑا سبب رہا ہے اور عرب میں جب اسلام کی دعوت اُٹھی تو اس کو بھی اِس سے سابقہ پیش آیا - لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے کچھ پیارے بندے ایسے ہیں جن کی بات کسی طرح نہیں ٹل سکتی - اُن کا دامن آدمی تھام لے، نذر نیاز اور پوجا پاٹ سے اُن کو خوش کرتا رہے، پھر دنیا میں جو چاہے کرے، اُن کی سفارش ہر جرم و گناہ کی سزا سے اُسے بچالے گی - اللہ کی بخشش اور مہربانیاں حاصل کرنے اور اپنے دل کی مرادیں پانے کا یہ آسان راستہ موجود ہوتے ہوئے کسی کو کیا پڑی ہے کہ تقوٰی اور پرہیزگاری کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال کر ہر گناہ کی لذت اور ہر ظلم و زیادتی کے فائدے سے اپنے آپ کو محروم کرلے - کفارِ عرب کا کہنا یہ تھا کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى " ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں" (الزمر-۳)- یعنی اللہ کی بارگاہ بہت اونچی ہے - اُس تک براہ راست ہماری پہنچ کہاں ہو سکتی ہے - اس لیے ہم ان بزرگ ہستیوں کو اُس تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں - نیز وہ کہتے تھے کہ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ " یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں" (یونس ۱۸)-

اس غلط عقیدے کی موجودگی میں نیکی اور بھلائی کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی - اسی لیے قرآن میں پے در پے اس پر ضرب لگائی گئی اور اس کا سراسر بے بنیاد ہونا ایسے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا گیا کہ کسی معقول آدمی کے لیے ایسی احمقانہ شفاعت کا قائل ہونا ممکن نہ رہا - مثلاً سورۂ مومن میں فرمایا: " اے نبی، اِن لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دو جو قریب آلگا ہے، جبکہ کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ

سپے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ معبود جنہیں یہ لوگ اُسے چھوڑ کر پکار رہے ہیں، تو وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔ حقیقت میں اللہ ہی سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۰)۔ اِن آیات میں شفاعت کے اِس مشرکانہ عقیدے کو بالکل پاش پاش کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اوّل تو بجائے خود یہ بات خلافِ عقل و انصاف ہے کہ ظالم کی سفارش کی جائے۔ پھر یہ خدا کی شانِ خدائی کے قطعی خلاف ہے کہ اُس کے بندوں میں سے کوئی ایسا سفارشی ہو جس کی اطاعت کی جائے، یعنی خدا اُس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو۔ اس پر مزید یہ بات کسی طرح تصور تک کرنے کے لائق نہیں ہے کہ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کی سفارش چلے جو دنیا میں ظلم کر کے آنے والے مجرم کی حمایت پر اُٹھیں اور یہ چاہیں کہ خدا اُس کو اُن کی خاطر معاف کر دے۔ اِس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ ایک حاکم جو کسی شخص کے جرائم سے خوب واقف ہے اور جس کو انصاف کے ساتھ اُس کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے، وہ ایسے لوگوں کو اُس کی سفارش کا حق دے دے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ وہ شخص کیا کچھ کر کے آیا ہے۔

دوسری جگہ اِس تصورِ شفاعت کی تردید ایک اور پُرزور دلیل سے کی گئی ہے۔ فرمایا: اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ (اس کا دعوے کرنے والے) حق کے ساتھ شہادت دیں اور وہ جانتے ہوں" (الزخرف - ۸۶)۔ یعنی جو شخص کسی دیوی، دیوتا یا بزرگ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اُسے لازماً شفاعت کے اختیارات حاصل ہیں اور اس کو ایسی شفاعت کا اختیار ہے جو رَد نہیں کی جاسکتی، وہ سامنے آئے اور علم کی بنا پر اس بات کی برحق شہادت دے۔ محض سُنی سُنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم و گمان پر ایسا ایک عقیدہ مان لینا سراسر لغو ہے جس کے "حق ہونے کی شہادت علم کی بنا پر" نہیں دی جاسکتی۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ کچھ ہستیوں کے لیے ایسے اختیارات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو "معلوم" ہے کہ اُنہیں یہ اختیارات حاصل ہیں اور ہم اس کی سچی "شہادت" دیتے ہیں۔

لیکن قرآن نے شفاعت کا قطعی انکار نہیں کیا، بلکہ بار بار یہ بتایا کہ شفاعت صرف وہ کر سکتا ہے جس کو اللہ نے اس کی اجازت دی ہو، اور صرف اُس کے حق میں کر سکتا ہے جس کے لیے شفاعت سُننے پر اللہ راضی ہو، اور اس پر مزید شرط یہ ہے کہ وہ حق کے مطابق شفاعت کرے، خلافِ حق و انصاف بات نہ کرے۔ پھر بھی شفاعت قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، وہ ہرگز کسی کی شفاعت ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ اِس

باب میں قرآن کی تصریحات یہ ہیں:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ-۲۵۵)	کون ہے جو اس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے؟
وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ۔ (سبا-۲۳)	اور اُس کے حضور شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس شخص کے جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو۔
یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا (النبا-۳۸)	جس روز رُوح (یعنی جبریل) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمان نے اجازت دی ہو اور وہ ٹھیک بات کہے۔
قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الزمر-۴۴)	اے نبی، کہہ دو کہ شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اُسی کی ہے۔

یعنی شفاعت سُننا یا نہ سُننا اور اسے قبول کرنا یا رد کر دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ کائنات کی بادشاہی کا مالک ہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے، اور کسی کا یہ مرتبہ نہیں کہ اُس کی شفاعت اللہ کو ضرور سُننی اور ماننی ہی پڑے۔

(باقی)